© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

ہمارا مسئلہ تعلیم

از سعید احمد

حصول آزادی کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ملک میں تعلیم کا معیار اونچا ہوتا۔ طلبار کی علمی استعداد بہتر اور اونچی ہوتی۔ اُن کے اخلاق بلند اور پسندیدہ ہوتے۔ اور اُن کا کردار و عمل ایک بڑے اور شاندار ملک کی روایات کے مطابق ہوتا۔ لیکن ان توقعات کے برخلاف موجودہ صورت حال یہ ہے کہ علمی اور فنی استعداد زوال پذیر ہے اور اس کا اندازہ یونیورسٹیوں کے نتائج سے لگایا جا سکتا ہے۔ ڈسپلن گویا مفقود ہی ہو گیا ہے۔ بزرگوں کا اور خاص طور پر اساتذہ اور یونیورسٹیوں کے حکام متعلقہ کا ادب و احترام اور اُن کا لحاظ و پاس جو ایک طالب علم کے فرائض اولین میں سے تھا روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ کل قوم کے اصل معمار اور ملک کی کشتی کے ناخدا وہی ہوں گے جو آج طالب علم کہلاتے ہیں اس بنا پر اگر آج انھوں نے تعلیم کی برکات سے فائدہ اٹھا کر کیرکٹر نہیں بنایا اور اپنے اندر صالح کردار و عمل پیدا نہیں کیا تو کل یہ ملک کی گراں بار ذمہ داریاں کس طرح اٹھا سکیں گے؟ اور قوم کو اُن کی ذات سے کیا فائدہ پہونچے گا؟ اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔

ہمارے موجودہ تعلیمی مسئلہ میں جو چند در چند گتھیاں پڑی ہوئی ہیں اگر اُن کی تنقیح کی جائے تو حسب ذیل امور غور طلب نظر آئیں گے۔

(۱) تعلیم کا انتظام اس طرح کیونکر کیا جائے جس سے بے روزگاری کے مسئلہ کا حل ہو سکے۔

(۲) اعلیٰ علمی استعداد اور فنی مہارت کیونکر پیدا کی جائے جس کے باعث ہمارے ملک میں مختلف علوم و فنون کے ماہر اور فضلا پیدا ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳) طلبا میں ڈسپلن اور اخلاقِ فاضلہ کیونکر پیدا کئے جائیں۔

اگرچہ اس سلسلہ میں ضمنی طور پر چند اور سوالات بھی پیدا کئے جاسکتے ہیں لیکن ملک کو آج جن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن کے پیشِ نظر بنیادی سوالات یہی تین چار ہیں۔ اب آپ ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ غور کریں۔

(۱) تعلیم یافتہ طبقہ میں بے روزگاری کا ایک یہ سبب تو ظاہر ہی ہے کہ ملک میں جس رفتار سے تعلیم ترقی کر رہی ہے اس رفتار سے ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی نہیں ہو رہی ہے حکومت کے شعبوں میں وسعت پیدا نہیں ہو رہی ہے اور اس طرح گویا ہماری تعلیمی پیداوار کی مثال اس مال اور سامان کی سی ہے جس کو کارخانے تیار تو کر رہے ہوں ایک بڑی مقدار میں مگر بازار میں اس کی مانگ اس کی پیداوار سے کم ہو اور اس بنا پر پیداوار اور مانگ میں تناسب و توازن قائم نہ رہے! لیکن درحقیقت اس عدم توازن کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ یورپ، امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے برخلاف ہمارے ملک میں تعلیم کا جو نظام قائم ہے اس پر بڑی حد تک "بھیڑ چال" کی مثل صادق آتی ہے یعنی ہمارے نوجوان طلبا اور طالبات جو تعلیم حاصل کرتے ہیں اس میں اُن کی ذہنی استعداد اور طبعی صلاحیت اور فطری رجحان و میلان کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ وہ یونیورسٹی میں داخلہ لیتے وقت بازار پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں اور جس فن کی قیمت ان میں سب سے زیادہ نظر آتی ہے اسی کو اپنے لئے منتخب کر لیتے ہیں۔ اس وقت وہ یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں عملی طور پر پائیدار اور مستقل قدر صرف ڈگری حاصل کرنے کی ہرگز نہیں ہو سکتی بلکہ کسی فن میں کمال اور مہارت پیدا کرنے کی ہی ہو سکتی ہے اور کوئی شخص مہارت اور کمال اسی فن میں پیدا کر سکتا ہے جس کے ساتھ اس کو فطری لگاؤ ہو، طبعی دلچسپی ہو اور جس میں مشغول رہ کر وہ تعب اور تکان کی بجائے قلبی مسرت اور روحانی لطف و حظ محسوس کرے اس بنا پر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مضمون کی بازار میں ہر دلعزیزی اور گراں قیمتی کو دیکھ کر طلبا کی ایک بڑی تعداد اسی طرف دوڑ پڑتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اسی مضمون میں بی، اے یا ایم، اے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مضمون خواہ کتنا ہی ہر دلعزیز ہو اور اس کی قیمت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو لیکن بہرحال اس کی مانگ محدود ہوتی ہے اس بنا پر جن طلبا نے اپنی فطری صلاحیت و استعداد کے باعث اس مضمون میں امتیاز پیدا کیا ہے ان کی بازار میں کھپت ہو جاتی ہے اور ان کے علاوہ دوسرے طلبا جنھوں نے محض نقالی کی تھی وہ بے روزگاری کا شکار بن جاتے ہیں۔

ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ ملک میں اقتصادی معاملات و مسائل کا چرچا ہوا تو طلبا اسی کی طرف مائل ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ جس طالب علم کو دیکھئے اقتصادیات میں ام، اے کر رہا ہے۔ اس کے بعد سائنس کا زور ہوا تو اب حال یہ ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فنون (ARTS) کی کلاسوں میں سناٹا نظر آئے گا اور لڑکا ہو یا لڑکی ہر ایک اپنے نظری رجحان و صلاحیت سے قطع نظر کئے ہوئے بی، ایس، سی - ایم، ایس، سی میں پڑھ رہا ہے - اس "چلو تم اِدھر کو ہوا ہو جدھر کی" پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اقتصادیات کی طرح سائینس کے مارکٹ میں بھی پیداوار اس کی اپنی اصل مانگ سے بہت زیادہ ہوگئی ہے اس صورتِ حال کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب یہ ناکام و نامراد طلبار کسی خاص ایک مضمون کی تکمیل میں اپنی عمر کا بہترین حصہ صحت اور روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی اس کو ذریعہ معاش بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے تو اب لامحالہ حصولِ معاش کے لئے انہیں کسی اور طرف کا رُخ کرنا پڑتا ہے اور اب اگر وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں تو چونکہ یہ چیز، یہ عہدہ، یا ملازمت ان کی توقعات سے بہت کم ہوتی ہے اور اس کی انھوں نے تکمیل بھی نہیں کی ہوتی، اس بنا پر وہ اس کام کو کرتے بھی ہیں تو بددلی اور بے رغبتی کے ساتھ اور پھر قہراً کچھ کرتے ہیں وہ ناقص بھی ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان لوگوں نے خود اپنے اوپر ہی ظلم نہیں کیا بلکہ اب جس ادارہ میں کام کر رہے ہیں اس پر بھی ظلم کر رہے ہیں - چنانچہ آج عام طور پر اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کا معیار جو پست ہوتا جارہا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان تعلیم گاہوں کے اساتذہ میں ایک خاصی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جنھوں نے کسی خاص مضمون میں ایم، اے کیا تھا اس توقع پر کہ وہ اس کے ذریعہ کوئی اعلیٰ سرکاری ملازمت حاصل کرسکیں گے لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو مجبوراً کسی اسکول میں ٹیچر یا کالج میں لکچرر ہو گئے ہیں اس طرح اس غلط نظامِ تعلیم کے باعث ملک میں صرف بے روزگاری ہی نہیں بڑھ رہی ہے بلکہ مختلف اداروں دفتروں اور کارخانوں میں ناموزوں و نامناسب آدمیوں کی جگہ پاجانے کی وجہ سے ان اداروں کے اصل کام کو بھی کافی نقصان پہونچ رہا ہے جس کا تجربہ اور مشاہدہ آج کل ہر جگہ کیا جا سکتا ہے -

اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا حل کیا ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ انگریزوں نے تعلیم سے متعلق جو غلامانہ ذہنیت پیدا کردی تھی اسے دور کیا جائے اور طلبا اور اُن کے والدین میں اس بات کا یقین اور قومی احساس پیدا کیا جائے کہ برطانوی حکومت کے زمانہ میں تعلیم، طبقاتی امتیاز و افتخار حاصل کرنے کا ذریعہ تھی اور اس کا مقصد محدود اور خود غرضانہ تھا یعنی سرکاری ملازمت حاصل کرنا اور اس کے ذریعہ دوسروں سے نمایاں اور ممتاز ہو کر رہنا، اس وقت یہ کوئی نہیں دیکھتا تھا کہ ملک کی ضرورتیں کیا ہیں اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اسے کس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے اس کے برخلاف ہر شخص تعلیم کو اپنے ذاتی مفاد اور شخصی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا اور اسی کے حساب سے اُس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدر و قیمت متعین کرتا تھا۔ وہ تعلیم اس خیال سے حاصل کرتا تھا کہ تعلیم پاکر وہ خود کیا ہو جائے گا۔ اسے اس کی پروا ہرگز نہیں ہوتی تھی کہ وہ تعلیم یافتہ ہو کر ملک کی کیا خدمت کر سکے گا۔ لیکن اب جبکہ ملک آزاد ہے اور اس کو ترقی دینا اور بڑھانا اس کے ہر شہری کا فرض ہے تو اب تعلیم کا مقصد کسی قسم کا طبقاتی امتیاز حاصل کرنا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ طبقاتی امتیاز کو ہی سرے سے مٹ جانا چاہیے۔ پہلے کرسی ذریعۂ امتیاز و افتخار تھی لیکن اب ایک وہ شخص جو کسی دفتر میں اونچی کرسی پر بیٹھ کر کام کرتا ہے اور وزیر کہلاتا ہے اور دوسرا وہ جو کسی میدان میں یا کھیتی میں کام کر رہا ہے دونوں ملک کے خادم ہیں قوم کے کارندے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کی قوم کو ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ دوسرے کی۔ اس بنا پر دونوں میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ اور سماجی و معاشرتی معاملات میں کسی ایک کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ روا نہیں رکھنا چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ نوجوانوں اور اُن کے والدین کے دلوں میں یہ احساس صرف چند لیڈروں کے تقریر کر دینے اور ان میں اخلاقی درس دینے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ ہماری معاشرت اور سماج کا نقشہ یک قلم بدل دیا جائے پُرانا ڈھنگ اور پُرانے طریقوں کو ختم کر کے معاشرت اور سماج کی تشکیل و تعمیر حقیقی معنوں میں جمہوری اور عوامی نہج پر کی جائے یعنی ایک ہی مجلس کے کسی ایک شخص یا چند اشخاص کی نسبت یہ محسوس نہ ہو کہ وہ مرتبہ، عزت اور وجاہت میں سب سے بڑے ہیں اور دوسرے اس سے کمتر اور فروپایہ ہیں۔ اُن میں اگر کوئی شخص زیادہ معزز ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ وزیر ہے یا مجسٹریٹ یا کسی محکمہ کا افسر اعلیٰ ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اپنے علم و فضل، اخلاق و عمل اور کردار و کیرکٹر کے اعتبار سے دوسروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ گویا عزت عہدہ کی، منصب کی، یا تنخواہ کی نہیں ہے بلکہ اس کے اپنے علمی و عملی اور اخلاقی کمالات و فضائل کی ہے۔ اگر ہم ایک ایسی غیر طبقاتی سوسائٹی اور ایک ایسا جمہوری و عوامی سماج پیدا کر سکیں تو انگلینڈ، امریکہ، روس اور فرانس وغیرہ کی طرح نوجوانوں میں تعلیم سے متعلق ایک آزاد نقطۂ نظر خود بخود پیدا ہو جائے گا اور وہ تعلیم اپنی فطری صلاحیت کے مطابق ملک کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے حاصل کریں گے۔ نہ کہ کوئی منصبی یا دفتری اعزاز و امتیاز حاصل کرنے کے لئے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ آج کل کی طرح ہر نوجوان کو نہ ڈگری حاصل کرنے کی دُھن ہوگی اور نہ ہر ایک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے درپے ہوگا بلکہ اعلیٰ تعلیم وہی حاصل کریں گے جو اس کے اہل ہونگے اور جن کو علم کے ساتھ طبعی دلچسپی اور فطری لگاؤ ہوگا۔ جب حسن پرستی ہر بوالہوس کا شعار نہ بن سکے گی تو لازماً اس کا اثر یہ ہوگا کہ شیوۂ اہل نظر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی آبرو بھی رہ جائے گی۔ علم کی مثال بارش کے پانی کی سی ہے وہی بوندیں ہیں جو سبزہ زار پر گرتی ہیں تو لالہ وگل پیدا کر کے اُسے گلزار بنا دیتی ہیں اور جب یہی بوندیں کسی عفونت کے ڈھیر پر پڑتی ہیں تو دبی ہوئی بدبو کو اُبھار کر اُسے فضا میں منتشر کر دیتی ہیں علم کے لئے وسیع حوصلہ، عالی ظرف اور بلند نظر درکار ہے۔ ہر ایک شخص اس مے مرد افگن کا حریف نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس طرح کی سوسائٹی پیدا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ وہ ابھی جلد ہی پیدا نہیں ہو گی۔ انتظار نہیں کیا جا سکتا اس لئے ہمیں خود بھی اپنے موجودہ نظام میں ایسی تبدیلی پیدا کرنی چاہیے جس پر عمل کرنے سے آج کل کی مشکلات کا حل ہو سکے۔ ترقی یافتہ ممالک میں قاعدہ ہے کہ ثانوی درجہ کی تعلیم کے بعد جو تقریباً ہر ایک کے لئے ضروری ہے طلبا کو دماغی نفسیات کے ماہر ڈاکٹروں کے سامنے معائنہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر بڑے غور و خوض اور توجہ سے طلبا کا امتحان کر کے یہ معلوم کرتے ہیں کہ کس طالب علم کو کس فن کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے اور اس اعتبار سے وہ کس لائن میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹروں کی یہ رپورٹ طلبا اور ان کے والدین دونوں کے حق میں ایک قطعی حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق طالب علم کو آئندہ تعلیم دلائی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں جہاں جو شخص ہے خوش ہے اور جس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ اُسے دلچسپی اور خوشدلی سے انجام دے رہا ہے۔ اگر یہ طریقہ ہم بھی اپنے ملک میں جاری کر سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس پر خاطر خواہ نتائج مرتب نہ ہوں۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنی ثانوی درجہ (سیکنڈری ایجوکیشن) کے نصاب میں بھی ایک جامع اور ہمہ گیر تبدیلی پیدا کرنی چاہیے۔ یعنی یہ نصاب ان سب مضامین پر گروپ وار شامل ہونا چاہیے جن سے کسی بھی طالب علم کو اپنی آئندہ تعلیم میں خواہ کسی قسم کی ہو۔ فائدہ پہونچے۔ اس نصاب کو آرٹس اور سائنس کے مضامین کے علاوہ کسی پیشہ کی تعلیم (Vocational Traning) پر بھی مشتمل ہونا چاہیے تاکہ جو طلبا ثانوی درجہ کی تعلیم پوری کرنے کے بعد کوئی صنعت و حرفت سیکھنا چاہیں تو وہ اسے سیکھ سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ابھی پچھلے دنوں حکومت کی مقرر کی ہوئی کمیٹی نے سیکنڈری ایجوکیشن پر جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں اس تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں۔

اعلیٰ علمی استعداد

دوسرا سوال یہ تھا کہ طلبا میں علمی استعداد جو کمزور ہوتی جا رہی ہے اس کا انسداد کیونکر کیا جائے۔ اس کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے اسباب کا سراغ لگایا جائے۔ اس صورتِ حال کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کا مقدس فرض جن لوگوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سپرد ہوتا ہے اُن میں ایک کافی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جنھوں نے اس پیشہ کو مجبوراً اور دوسری طرف سے مایوس ہو کر اختیار کیا ہے اُن لوگوں میں خود علم کے صحیح ذوق کا فقدان ہوتا ہے۔ جب ان میں ذوق نہیں ہے تو وہ اپنے شاگردوں میں اس علم یا فن کا ذوق اور اس سے دلچسپی کس طرح پیدا کر سکیں گے۔ ان اساتذہ میں علم کا ذوق کتنا ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے شوق میں تحقیق اور ریسرچ کا کام کرتے ہیں لیکن جہاں وہ ڈاکٹر ہوئے اور ان کو یونیورسٹی میں صدر شعبہ کا عہدہ ملا بس اب لکھنا پڑھنا سب غائب ہو جاتا ہے تحقیق اور ریسرچ کا کبھی نام بھی نہیں لیتے اور اب ان کا کام صرف ایک اعلیٰ قسم کی زندگی بسر کرنا ہو جاتا ہے۔ اب لکھنے پڑھنے کا اگر وہ کوئی کام کرتے بھی ہیں تو صرف روپیہ کمانے کے لئے تاکہ اُن کی اونچی زندگی کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں یہ ایک عام حالت تو آزادی سے پہلے بھی تھی لیکن آزادی کے بعد ایک دوسری مصیبت یہ آئی ہے کہ جو پروفیسر اپنے کام کا ماہر یا اس میں مشہور و نیکنام ہوتا ہے حکومت اُسے کسی نہ کسی ایک محکمہ میں بڑے عہدہ اور بڑی تنخواہ پر ملازم رکھ لیتی ہے یا وہ کسی کمیشن کا ممبر مقرر کر دیا جاتا ہے اور اب اُس کے اوقات کا ایک بڑا حصہ کمیشن کے کاموں میں یونیورسٹی سے باہر صرف ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کو علم کا ذوقِ صحیح حاصل ہو جائے وہ مادی مرغوبات اور دنیوی آسائشوں اور لذتوں سے اس درجہ بے نیاز ہو جاتا ہے کہ پھر کسی اور چیز کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ یونان کے مشہور فلسفی دیوجانس کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ سکندر اعظم اس سے ملنے گیا اور جب چلنے لگا تو اس نے ازراہِ عقیدت و ارادت کہا کہ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے۔ دیوجانس نے جو دھوپ کا بہت شوقین اور قدر دان تھا فوراً جواب دیا کہ "بس آپ مہربانی کر کے میری دھوپ چھوڑ دیجئے جسے روک کر آپ کھڑے ہو گئے ہیں مجھے کچھ اور نہیں چاہیئے"۔

کس قدر افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ ہمارے علمی ذوق کی حقیقت تو بس اتنی ہے کہ جہاں بڑی تنخواہ یا اعزاز کی کوئی نوکری ملی اور پھر جو کچھ پڑھا تھا وہ سب طاقِ نسیاں کی نذر۔ لیکن یورپ میں علمی ذوق کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے لائق دوست شیخ محمد عنایت اللہ گورنمنٹ کالج لاہور نے خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ ایک روز شام کے وقت وہ لندن میں اپنے اُستاد پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ بیٹھے ہوئے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں پروفیسر آرنلڈ نے اچانک سوال کیا "عنایت اللہ! تم فوراً جواب دو کہ اس وقت تمہارے دل میں دنیا کی بڑی سے بڑی کونسی لذت کی

© rasailojaraid.com